سلسلہ مطبوعات ۲۹

اجتماعی زوال کے اسباب

مولانا محمد تقی امینی

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

حرفِ اوّل

آج امت مسلمہ جس نکبت وزوال سے دوچار ہے، وہ حساس ذہنوں کیلئے ایک مستقل الجھن بن چکی ہے۔ اس زوال کے بنیادی اسباب کا جب تک درست سمت میں تجزیہ نہیں کیا جائے گا، صحیح خطوط پر اسکا حل تلاش کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔

آج کا زوال کسی فرد واحد یا کسی ایک گروہ کا زوال نہیں، نہ ہی یہ کسی ایک شعبہ کا مرض ہے بلکہ معاشرے کے تمام ادارے اس سے نہ صرف آشنا ہو چکے ہیں بلکہ اس سے پیدا شدہ رویے مستقل طور پر ہمارے اجتماعی مزاج کا حصہ بن گئے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں برعظیم کی دور حاضر کی ایک صاحب فکر شخصیت نے قرآن حکیم کی روشنی میں **اجتماعی زوال کے اسباب** کا جامع مگر مختصر انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ قارئین اس مضمون کے مطالعہ سے یقیناً یہ محسوس کریں گے کہ قرآن کریم ہمارے گردوپیش کی ہی آنکھوں دیکھی صورتحال کی نقاب کشائی کر رہا ہے۔ اور اسی سے یہ داعیہ جنم لیتا ہے کہ عصری تقاضے کے مطابق اجتماعی زوال سے نکلنے کیلئے اجتماعی جدوجہد کا اس انداز میں ڈول ڈالا جائے کہ معاشرہ فطری اقدار قائم ہونے کی راہ پر چل نکلے اور یہ حقیقت ہے کہ ذمہ داری سے صرف جواں عزم اور بلند نظر افراد کی اجتماعیت ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نئے معاشرے کی تشکیل و تنظیم آپ کے فولادی عزم کی منتظر ہو۔ تو پھر اپنے فرائض کو پہچانیئے۔

چیئرمین

سلسلہ مطبوعات (۲۹)

اجتماعی زوال کے اسباب

مولانا محمد تقی امینیؒ

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

مضامین ایک نظر میں

اجتماعی زوال کے اسباب ____ 5

شرک ونفاق ____ 5

نفاق کی شکلیں ____ 6

شرک ونفاق کے اجتماعی زندگی میں اثرات ____ 8

بے عملی وبدعملی ____ 15

سیرت کی تشکیل میں بے عملی وبدعملی کے مظاہر ____ 15

عصری تقاضوں سے غفلت کے مظاہر ____ 22

ایک غلط فہمی کا ازالہ ____ 24

چند علماء یورپ کی شہادتیں ____ 24

بے عملی وبدعملی تاریخ کے آئینہ میں ____ 26

باطل پرستی وخود فریبی ____ 29

عدم استقامت وخود غرضی ____ 32

جوانی اور بڑھاپے کی ایک نئی تقسیم ____ 34

ماہرین نفسیات کے ایک شبہ کا جواب ____ 35

نام پمفلٹ — اجتماعی زوال کے اسباب

تحریر۔ — مولانا محمد تقی امینیؒ

طبع دوم۔ — جون ۲۰۰۶ء

ناشر۔ — شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن پوسٹ بکس نمبر ۹۳۸ گلگشت ملتان۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتماعی زوال کے بنیادی اسباب

اجتماعی زوال کے چار بنیادی اسباب ہیں۔

(۱) شرک ونفاق۔ (۲) بے عملی وبدعملی۔

(۳) باطل پرستی وخودفریبی۔ (۴) عدم استقامت وخودغرضی۔

ان کے مفہوم میں عمومیت اسطرح پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۱) جن اصول ونظریات پر کسی تحریک کی بنیاد ہو یا کسی قوم کی تنظیم ہوئی ہو انہیں تسلیم کرنے کے باوجود شرک یا نفاق کی وجہ سے دل میں یقین واذعان کی وہ کیفیت نہ پیدا ہو جو ایمان کا خاصہ اور نتیجہ ہے۔

(۲) اصول ونظریات کو بروئے کار لانے کیلئے جن جن صلاحیتوں اور تدبیروں کی ضرورت پڑے اور جس جس قسم کی طاقت وقربانی کا مطالبہ کیا جائے قوم کے افراد اس کیلئے تیار نہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کر رہے ہوں۔

(۳) حق پرستی کی بجائے باطل پرستی کی جانب مائل ہوں اور تبلیغِ حق کی جگہ خودفریبی میں مبتلا ہوں۔

(۴) قوم کے افراد میں استقلال اور ضبطِ نفس کا فقدان ہو اور بے ثباتی وخودغرضی ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر گئی ہو۔

قرآن حکیم کی روشنی میں ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے

شرک ونفاق

شرک کا مطلب اللہ کی ذات، صفات اور افعال میں کسی کو شریک کرنا ہے۔ اس کا اصل

تعلق عقیدہ سے ہے۔نفسیاتی لحاظ سے جب عقیدہ میں تزلزل پیدا ہوجائے یا وہ کمزور پڑ جائے تو پھر زندگی کی کوئی کل درست نہیں رہ سکتی۔

ماہرین اجتماعیت کے نزدیک نظریات وعقائد کی حیثیت ستون کی ہے۔ اور قومی وجماعتی زندگی کو اصل خطرہ اصول وعقائد کے عدم اذعان (یقین نہ ہونے) ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے شرک کا اثر زندگی کے تمام گوشوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور اس کے پورے نظام کو درہم برہم کرتا ہے۔

نفاق کی عموماً دو ہی شکلیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) کسی نظام زندگی کے بروئے کار آنے کے بعد مخالفین کا گروہ مفاد کے حصول کی خاطر یا مضرت کے دفعیہ کی غرض سے اس کی تعلیمات کو ایک حد تک اپنا لیتا ہے لیکن دل سے نہیں مانتا ہے

(۲) دل سے ماننے والوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن میں یقین وعمل کی وہ روح نہیں پیدا ہوتی جو کسی تعلیم کو حقیقی معنوں میں قبول کر لینے کے بعد ہونی چاہیئے۔ اور اخلاص وصداقت کے وہ جوہر نہیں نمایاں ہوتے جو کمال ایمانی کا نتیجہ ہیں۔

یہ حالت درج ذیل اسباب سے ہوتی ہے۔

(۱) قدیم رسم ورواج کا غلبہ (۲) خواہشات نفسانی کی اتباع وپیروی (۳) ذاتی اغراض ومفاد (۴) لذات دنیوی کے ساتھ چسپیدگی (۵) تقلیدی جمود وغیرہ (الفوز الکبیر ص ۱۰)

رسول اللہ ﷺ کے آمدہ فرمان میں یہی نفاق مراد ہے۔

''چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں یہ چاروں جمع ہوجائیں وہ پورا منافق ہے۔ اور جس میں کوئی ایک پائی جائے تو سمجھا جائے گا کہ نفاق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی اگر چہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اس گمان میں ہو کہ وہ پکا مسلمان ہے۔ وہ چار خصلتیں یہ ہیں۔

(۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے (۳) جب امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے (۴) جب لڑائی جھگڑا ہو تو بدزبانی کرے'' (صحیح مسلم)

حضرت حذیفہؓ کے ایک قول سے بعض حضرات کو دھوکا ہوا کہ نفاق صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں پایا جاتا تھا اس کے بعد وہ ختم ہو گیا حالانکہ قرآن حکیم نے نفاق کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نفاق کسی دور اور زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسی حقیقت ہے کہ ہمیشہ پایا گیا ہے۔ اور پایا جاتا رہے گا۔

وہ قول یہ ہے:

نفاق رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھا مگر آج کفر ہے یا ایمان (مشکوۃ ص ۱۸)

اس قول میں نفاق سے اس کا حکم مراد ہے رسول اللہ کے زمانہ میں چند مصلحتوں کی وجہ سے یہ حکم تھا کہ منافقین سے تعرض نہ کیا جائے، ان کے معاملہ میں پردہ پوشی سے کام لیا جائے لیکن آج (عہد حذیفہ) ان مصلحتوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ حکم باقی نہیں۔

(حاشیہ مشکوۃ ص ۱۸)

صورت یہ ہے کہ انقلاب کے بعد قوم جب نئی نئی تعمیری میدان میں قدم رکھتی ہے تو اس کیلئے یہ بات نہایت اہم قرار دی جاتی ہے کہ وہ داخلی انتشار اور افراتفری میں نہ مبتلا ہو، ورنہ صلاحیتیں آپس میں ایک دوسرے کے دست و گریبانی میں مصروف ہو جائیں گی اور تعمیری کام رک جائیں گے نیز باہر کے لوگوں کو بدنام کرنے اور ہنسنے کا موقع ملے گا۔

ظاہر ہے کہ ابتدا میں اگر منافقین کے خلاف قانونی کاروائی کی جاتی تو ان کے گھلے ملے رہنے کی وجہ سے داخلی انتشار اور افراتفری سے بچاؤ ناممکن تھا اور دوسری طرف باہر کی دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے بعد مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے یہ کسے خبر تھی کہ مسلم اور منافق میں فرق ہے، لیکن قوم جب مضبوط ہو جائے اور اس کی تعمیری صلاحیتیں ابھر آئیں تو پھر شر پسندوں کا صفایا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت حذیفہؓ نے آخر کے ٹکڑے میں فرمایا۔

ذیل میں قرآن حکیم کی روشنی میں شرک و نفاق کے چند اثرات اجتماعی زندگی میں بیان

کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ زوال کے بارے میں یہ دونوں کس قدر دور رس نتائج کے حامل ہیں؟

شرک ونفاق کے اجتماعی زندگی میں اثرات

(۱) اصول ونظریات پر عزم ویقین کی وہ روح نہیں باقی رہتی جو انسان کو سرتا پا عمل بناتی ہے اور رعب وہیبت قائم رکھتی ہے۔ (سورۃ آل عمران آیت ۱۴۵)

اس کی شہادت فلسفہ تاریخ سے بھی ملتی ہے جیسا کہ قدیم رومن قوم کی حقیقی عظمت دو چیزوں میں بیان کی جاتی ہے ایک تو یہ کہ انکی ضروریات زندگی محدود تھیں اور دوسری یہ کہ ان کا اعتقاد نہایت قوی تھا حتی کہ ان کا ہر شخص جان ومال اہل وعیال غرض سب کچھ اعتقاد پر قربان کر دیتا تھا۔ (انقلاب الامم ص ۱۴۷)

(۲) زندگی میں نظم اور مرکزیت نہیں باقی رہتی اور اطاعت واتحاد کا جذبہ فوت ہو جاتا ہے ارشاد خداوندی ہے!

''جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو ایک گروہ ان میں کا اعراض وروگردانی کرتا ہے''۔ (سورۃ النور آیت ۴۹)

(۳) دل کا استحکام اور اللہ پر کامل اعتقاد نہیں رہ جاتا، جس سے ہمت پست رہتی ہے ضبط نفس اور پامردی کی روح فنا ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ زندگی کے عناصر، اقدام، عزم، شجاعت، ارادہ وغیرہ سب میں زوال آجاتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے ایمان والی زندگی کو ''القول الثابت'' (مستحکم بات) سے تعبیر کیا ہے اور حقیقی ایمان سے محروم زندگی کو ''مالھا من قرار'' (جس کو ثبات نہیں) سے۔ (سورۃ الرعد آیت ۳۶)

نیز ایسی حالت میں طبیعت طرح طرح کے اوہام وخیالات کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

ارشادربانی ہے۔

''ایسے لوگ اللہ کی جناب میں عہد جاہلیت کے سے ظنون واوہام (شکوک وشبہات) رکھتے ہیں''۔

(سورۃ آل عمران آیت ۱۴۹)

(۴) ظاہر وباطن میں یکسانیت نہیں رہتی ہے جب تک ذاتی اغراض ومفاد کا سوال نہ ہو ان کے اقوال وافعال ہر طرح سے آراستہ دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ایثار وقربانی کا وقت آتا ہے یا کسی ادنی مفاد پر ضرب پڑتی ہے تو بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے ہیں ان میں سہار دبرداشت کی طاقت بالکل نہیں ہوتی ہے۔

قرآن حکیم نے اس صورتحال کی تعبیر درج ذیل آیت میں نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کی ہے۔

''جب تم انہیں دیکھو تو ان کی ظاہری حالت نہایت اچھی معلوم ہوا گر وہ بات کریں تو تم ان کی بات سنتے رہو گویا کندے (لکڑیاں) ہیں جو دیوار سے لگ کر کھڑے ہیں (سہار کی طاقت بالکل نہیں) ہر چیخ وپکار کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں ایسے لوگ دشمن ہیں، ان سے بچو''۔

(سورۃ المنافقون آیت ۶)

آیت کا ہر ٹکڑا مستقل ایک حالت اور اس کے اثرات کا ترجمان ہے واقعات ومشاہدات کو سامنے رکھ کر جس قدر آپ غور کریں گے حقیقت کھلتی جائے گی۔

(۵) مقصد واضح شکل میں سامنے نہیں رہتا ہے جس کی بناء پر جدوجہد کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور تن پروری وعیش پرستی کی ذہنیت نمودار ہو جاتی ہے۔ (سورۃ التوبہ آیت ۵۱)

آج دنیا کے سامنے ذاتی اغراض ومفاد مقصد کی حیثیت رکھتے ہیں اس میں شک نہیں کہ دنیا کی قومیں اس کیلئے پوری جدوجہد کرتی ہیں جب وہ قانونِ قدرت کے مطابق کامیابی حاصل کرتی ہیں۔

لیکن رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی رضا وخوشنودی کو مقصد ٹھہرایا چنانچہ صحابہ کرامؓ کی ساری

جدوجہد اللہ کے نام پر اسی مقصد کے حصول کیلئے ہوتی تھی۔ جس طرح ان کا مقصد بلند تھا ایثار وقربانی کا جذبہ بھی ان میں زیادہ تھا اسی بناء پر غیر معمولی کامیابی ان کا قدم چومنے پر مجبور تھی۔ یورپ کا فاتح اعظم نپولین مسلمانوں کی کامیابی پر ہمیشہ حیران رہا، اور کہا کرتا تھا کہ:

''محمد نے عربوں کو از سر نو پیدا کیا تھا ان کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن دے کر فرمایا تھا کہ جاؤ دنیا فتح کرو۔ حکومت کرو اور فائدہ اٹھاؤ''

افسوس کہ مسلمانوں کے پاس اب نہ قرآن باقی رہا اور نہ تلوار (جہدوجہد) رہ گئی، قرآن کی جگہ چند گھڑے ہوئے عقیدوں اور وہم وخیال کی باتوں نے لے لی (سورۃ البقرہ آیت ۷۳) اور تلوار (جدوجہد) کی جگہ بے روح دعاؤں نے قبضہ کرلیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر قیام وبقاء کی جدوجہد کیلئے صرف دعائیں کافی ہوتیں اور چند رسم ورواج کی پابندی اور نام کی مسلمانی سے کام چل جاتا تو صحابہ کرام اور اسلاف امت کو تن، من، دھن قربان کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور نہ قرآن حکیم میں جدوجہد سے متعلق درج ذیل قسم کی آیتیں مذکور ہوتیں۔

(۱) انسان کیلئے وہی کچھ ہے جو اس نے جدوجہد کی ہے۔ (سورۃ النجم آیت ۳۸)

(۲) اے پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیجئے تم عمل کئے جاؤ اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل دیکھے گا۔ (سورۃ التوبہ آیت ۱۰۵)

(۳) انسان کی جدوجہد یقیناً دیکھی جائے گی اور اسکو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (سورۃ النجم آیت ۳۹، ۴۰)

(۶) محنت اور مشقت کے کام نہیں ہو پاتے ہیں عافیت کوشی، مصلحت پسندی، سخن پروری اور حیلہ سازی وغیرہ جیسے جراثیم زندگی میں نمودار ہوجاتے ہیں۔ (سورۃ التوبہ آیت ۴۲)

مذہبی طبقہ ان جراثیم کا خصوصیت سے شکار ہوتا ہے کیونکہ اس کا مذہب ایسی حالت میں

افادیت وصلاحیت کے جوہر کھو دیتا ہے اور دنیا طلبی وہوس رانی کا ذریعہ بن جاتا ہے، چنانچہ قدیم یورپ میں بہت سے لوگ محض اس بناء پر راہبوں میں شامل ہوتے تھے کہ محنت مزدوری کے بغیر وہاں مفت کی روٹی ملتی تھی۔ اور گرجا کے بہت سے خادم ایسے تھے جنہوں نے مخصوص ملکی ذمہ داریوں اور کام سے بچنے کی غرض سے یہ طریق زندگی اختیار کرلیا تھا (تاریخ اخلاق یورپ ص ۱۰۱)

(۷) ذاتی اغراض ومفاد کی بندگی ہوتی ہے اپنے معمولی مفاد کیلئے قوم کے پہاڑ جیسے نقصان کی پروانہیں ہوتی ہے۔ جب کوئی قومی وجماعتی فلاح وبہبود کے کام کرنے کا وقت آتا ہے تو طرح طرح کے شبہات اور طرح طرح کے اندیشے ظاہر کئے جاتے ہیں جن سے عوام سہم جاتے ہیں اور کام میں رکاوٹ ہو جاتی ہیں۔ نہ قومی مصیبت کسی کیلئے مصیبت رہ جاتی ہے اور نہ قومی خوشی کسی کیلئے خوشی، بس ہر ایک اپنا ہی مفاد سوچتا ہے اور اپنی خوشی کو خوشی جانتا ہے۔

(سورۃ التوبہ آیات ۴۶ تا ۵۰)

جب قوم کے دل میں خودغرضی اپنا قدم جما لیتی ہے۔ تو رفتہ رفتہ اس کے تمام محاصل ختم ہو جاتے ہیں۔ ''روسو'' نے مذکورہ حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

''اپنی ذات سے محبت اور اپنی فکر بُری چیز نہیں، مگر جب دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ کرنے کا جذبہ دلوں میں جاگزیں ہو جائے تو پھر سماج کی تباہی ناگزیر ہے''۔ (معاہدہ عمرانی ص ۲۷)

(۸) قومی وجماعتی شعار کی ادائیگی ایسے بے دلی اور بدذوقی کے ساتھ کی جاتی ہے گویا کوئی بوجھ سر پر آپڑا ہے کہ جلدی پٹک کر اس سے چھٹکارا ملے اس میں نہ جذب وانجذاب (ذوق وشوق) کی کیفیت ہوتی ہے اور نہ ہی دلجمعی واطمینان کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۲)

(۹) کچھ لوگ الگ تھلگ رہ کر حالات وواقعات کی رفتار کا جائزہ لیتے ہیں جس جماعت کا جب پلہ بھاری دیکھا بس اسی کے ساتھ شریک ہو گئے اور باتیں بنا کر گذشتہ سے عذر ومعذرت کردی۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۲)

بعض لوگ مخالفین سے ساز باز رکھتے ہیں ادھر کی باتیں ادھر لگاتے ہیں جب کوئی بات کھل جاتی ہے تو قسمیں کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

(سورۃ النساء آیت ۱۳۹، سورۃ التوبہ آیت ۵۶)

اسی میں وہ صورت بھی داخل ہے کہ مغلوب قوم کے افراد غالب قوم سے مل جاتے ہیں پھر انہیں عہدہ دے کر یا انعام واکرام کی بارش کر کے ان کے ذریعہ پوری قوم کے دبانے کا کام لیا جاتا ہے۔ فرعون بدنام ہے اس کے ملأ (پارلیمنٹ کے ممبروں) نے موسیٰ علیہ السلام کے تحفظِ حقوق کی آواز کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا تھا جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

فرعون کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کہا کہ آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو ایسی حالت میں چھوڑ دیں گے کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلائیں؟ (سورۃ الاعراف آیت ۱۷)

لیکن آج دنیا کی حکومتوں میں یہ طریق کار بہت عام ہے، اس میں پیش پیش وہ افراد دکھائی دیتے ہیں جو اقلیتوں کے نمائندہ ہوتے ہیں کیونکہ انہیں دوسروں کے مقابلہ میں اظہار وفاداری کی زیادہ ضرورت رہتی ہے۔

(۱۰) اخلاص وصداقت کی روح نکل جاتی ہے پھر جائز وناجائز درست ونادرست جس طرح بھی مال ملے اس کے حصول کی کوشش ہوتی ہے۔ (سورۃ التوبہ آیت ۵۸)

(۱۱) ایمان ویقین کی دولت سے محرومی کی وجہ سے قوت ارادی مفقود ہو جاتی ہے عزم وہمت کے کام کے وقت ایسی روش اختیار کی جاتی ہے جس سے انتہائی بزدلی اور کمینہ پن کا ثبوت ملتا ہے۔ (سورۃ التوبہ آیت ۵۷)

(۱۲) اتباع دین کی روح مفقود ہو جاتی ہے، دینداری کی نمائش محض اس لئے ہوتی ہے کہ اسے دنیا کے حصول کیلئے آلہ کار بنایا جائے اس نمائش میں فروعی اور معمولی باتوں پر زور دیا جاتا ہے اور بنیادی واصولی احکام کی طرف کوئی توجہ نہیں رہتی ہے۔

(۱۳) فرقہ بندی وگروہ بندی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے حق پرستی کی جگہ گروہ پرستی آجاتی

ہے۔اچھائی وبرائی کے جانچنے کیلئے اعتقاد وعمل کو معیار نہیں ٹھہرایا جاتا ہے بلکہ یہ کہ وہ ہمارے گروہ میں داخل ہے یا نہیں، اگر وہ داخل ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی برے ہوں اور اگر نہیں داخل ہے تو وہ برا ہے خواہ اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔

(سورۃ البقرہ آیت ۱۱۵)

(۱۴) تعمیری کاموں کی طرف توجہ نہیں رہتی ہے پس ہر گروہ دوسرے گروہ کی تحقیر وتذلیل کو دین وایمان کی سب سے بڑی خدمت سمجھنے لگتا ہے۔ (سورۃ البقرہ آیت ۱۰۸)

(۱۵) کذب گوئی و وعدہ خلافی سے کام نکالنے کو ہنر سمجھا جاتا ہے ان کی برائی کی اہمیت دل سے نکل جاتی ہے۔ (سورۃ التوبہ آیت ۷۷)

(۱۶) قومی وجماعتی خدمت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، اگر کچھ لوگ خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اس فریضہ کو انجام بھی دیتے ہیں تو انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے مثلاً مالدار لوگ خرچ کرتے ہیں تو اسے زیادہ نمود اور شہرت کا نام دیا جاتا ہے اور غریب لوگ خرچ کرتے ہیں تو ان کا مذاق اڑتا ہے۔ (سورۃ التوبہ آیت ۷۹)

(۱۷) مذہب کے نام پر ایسی ایسی باتیں نکلتی ہیں جو باہمی تفرقہ اور انتشار کا باعث بنتی ہیں۔

(سورۃ التوبہ آیت ۱۰۷)

(۱۸) غلط قسم کا تقلیدی جمود پیدا ہو جاتا ہے اور خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اسے حق پر ثابت قدمی کا نام دیا جاتا ہے حالانکہ تقلیدی جمود اور ثابت قدمی میں بڑا فرق ہے، اول الذکر احساس وشعور کے موت کی سب سے بڑی علامت ہے اور آخر الذکر زندگی کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

(سورۃ البقرہ آیت ۸۳)

(۱۹) حقائق کی طرف سے نظر پھر جاتی ہے جادو، ٹونے، ٹوٹکے اور دوسری بہت سی وہمی و خیالی باتوں پر نظر جم جاتی ہے۔ (سورۃ البقرہ آیت ۹۶)

(۲۰) اہل دین حق فروش بن جاتے ہیں، اپنی رایوں اور خواہشوں کو اللہ کے احکام پر ترجیح

دیتے ہیں اور اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو کتاب اللہ کی طرح واجب العمل بتاتے ہیں۔
(سورۃ البقرہ آیت ۷۴)

(۲۱) زندگی کی کشاکش سے نبرد آزمائی اور مصائب ومشکلات کے جھیلنے کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور طرح طرح کی بے ایمانی اور بے اعتقادی کی باتوں اور حرکتوں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

(۲۲) ہوا وہوس کا غلبہ ہو جاتا ہے حتی کہ حق وصداقت کے قبولیت کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ (سورہ محمد آیت ۱۶)

(۲۳) اللہ پر نظر نہیں رہتی ہے بلکہ دوسری چیزوں کو مؤثر بالذات سمجھنے کا رواج عام ہو جاتا ہے اسی بنا پر خوف وبزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور کسی مہم میں شرکت کی جرأت وہمت باقی نہیں رہتی۔
(سورہ محمد آیت ۲۶، سورہ الفتح آیت ۱۱)

(۲۴) اللہ سے زیادہ انسانوں کا خوف ہو جاتا ہے۔ (سورہ الحشر آیت ۱۳)

(۲۵) سچائی کے پرستاروں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور حتی الامکان ان سے دور رہنے کی کوشش ہوتی ہے۔ (سورۃ المائدہ آیت ۶۳)

(۲۶) جن کو صداقت کی بات قبول کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے اور راعیوں کے ساتھ تکبر وسرکشی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ (سورۃ المائدہ آیت ۱۲)

(۲۷) بات کر کے پھر جانا، قسموں کے ذریعہ مطلب برآری کرنا وغیرہ لوگوں کا شیوہ بن جاتا ہے۔ (۲۳/۱۳)

(۲۸) آپس میں ایک دوسرے کے قلوب مختلف ہوتے ہیں اگر کہیں اتحاد نظر بھی آتا ہے تو وہ ظاہری طور پر کام نکالنے کیلئے ہوتا ہے، فائدہ اور غرض کے وقت اپنے پرائے دوست کی پرواہ نہیں رہ جاتی ہے وغیرہ۔ (۴۹/۱۲)

(۲۹) ایثار وقربانی کے بغیر جہاں مالی منفعت کی امید ہوتی ہے وہاں لوگ سب سے آگے نظر آتے ہیں اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو اسے حاسد وغیرہ کے نام سے مطعون کرتے ہیں۔
(۳۸/۱۵)

(۳۰) لوگ تمناؤں اور آرزوؤں میں پھنس کر عزیمت وہمت کے کاموں سے جان چراتے ہیں۔ (۵۷/۸)

غرض دل کی روحانیت ختم ہو کر جماعتی مزاج پر شیطان کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ہوا و ہوس کی حکمرانی چلتی ہے۔ (۵۵/۱۸)

(۲) بے عملی و بدعملی

اس کی دو صورتیں ہیں

(۱) سیرت کی تشکیل اور تنظیم سے متعلق جو اخلاقی ہدایتیں ہیں ان سے پہلو تہی کی جائے یا ان کے خلاف عمل کیا جائے۔

(۲) حالات و زمانہ کے تقاضا کی مناسبت سے قیام و بقاء کیلئے جس قسم کی مادی جد و جہد درکار ہے اس سے غفلت برتی جائے اور قرآن حکیم نے بے عملی اور بدعملی کے مختلف مظاہر بیان کئے ہیں۔ سیرت کی تشکیل و تنظیم سے متعلق چند یہ ہیں۔

سیرت کی تشکیل میں بے عملی و بدعملی کے مظاہر

(۱) اخلاقی سطح نہایت پست ہو جاتی ہے۔ کردار کا کوئی معیار باقی نہیں رہتا ہے اور معاصی کے ارتکاب میں بے باکی ہو جاتی ہے۔ حتی کہ رفتہ رفتہ معاصی کا احساس بھی دل سے نکل جاتا ہے قرآن حکیم میں ہے۔

''اور کتنی ہی بستیاں ظلم و شرارت میں غرق تھیں ہم نے پامال کر ڈالا اور ان کے بعد دوسرے گروہوں کو لا کھڑا کیا''۔ (سورۃ الانبیاء آیت ۱۱)

آیت میں ''ظالمہ'' کا لفظ ہے اور ظلم کے معنی وضع الشئی فی غیر محلّہ ہیں (جس چیز کا جو محل ہو اس کا وہاں نہ ہونا) ایک موقع پر شرک کو ''ظلم عظیم'' کہا گیا (سورۃ لقمان آیت ۱۳) کیونکہ اس سے بڑھکر اور کوئی بے محل بات نہیں ہوسکتی ہے۔ اسی طرح تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کا ارتکاب انسان کا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ (سورۃ فاطر آیت ۳۲) کیونکہ قرآن حکیم نے انسان کی عظمت و بلندی کا جو مَوقف (مقام) مقرر کیا ہے وہ سب اس کے خلاف ہیں اور اس لحاظ سے سب ''وضع الشئی فی غیر محلّہ'' میں داخل ہیں۔

(۲) دوسری آیت میں اخلاقی پستی و بے حسی کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

''بے شک اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ انسان ہیں جو بہرے گونگے ہیں اور سمجھتے نہیں ہیں''۔ (سورۃ الانفال آیت ۲۲)

انسان کی عظمت و بلندی کا اصل راز اس کے اخلاق و کردار میں مضمر ہے۔ کسی زندگی میں جب یہ باقی نہ رہ جائیں تو اسکی حیثیت جانوروں سے بدتر ہوجاتی ہے نیز اخلاق و کردار میں تسخیری و تنظیمی صلاحیت کے جوہر موجود ہیں جن سے ظاہری و باطنی دشمن سے مقابلہ کے وقت کام لیا جاتا ہے چنانچہ قرن اوّل میں رومیوں کا جب مسلمانوں سے مقابلہ ہو رہا تھا اور رومی دمشق و حمص کے میدان میں پے در پے شکستیں کھا رہے تھے تو قیصر روم نے اپنے چند فوجی سرداروں کو بلا کر پوچھا کہ ''عرب کے فتوحات کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ تم تعداد و قوت و طاقت اور سامان جنگ میں ان سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہو'' اس پر ایک بوڑھے اور تجربہ کار افسر نے جواب دیا کہ

''عرب کے پاس اخلاق کی طاقت ہے اور یہ ہمارے پاس نہیں ہے وہ رات کو عبادت کرتے ہیں۔ دن کو روزہ رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، اپنے پرائے سب کے ساتھ برابری کا معاملہ کرتے ہیں اور ہم شراب پیتے ہیں، بدکاری کرتے ہیں، وعدہ خلافی کرتے ہیں اور اللہ کی مخلوق پر ظلم کرتے ہیں''

(۳) ترقی کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں یاس و قنوطیت کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ بلند

پروازی اور اولوالعزمی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں پھر عارضی اور معمولی فائدوں کو مقصد حیات سمجھ کر اسی کی جدوجہد میں ساری زندگی گذر جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے مختلف قوموں اور پیغمبروں کے تذکرہ میں عمل اور ردعمل کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے مذکورہ بالا حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔

نیز قوم بنی اسرائیل کو جب موسیٰ علیہ السلام نے زندگی کی تعمیر اور صلاحیتوں کی تنظیم کا حکم دیا تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے اس سے پہلوتہی کی۔ بلکہ فرعونی حکومت ہی کو ترجیح دینے لگے اور موسیٰ علیہ السلام سے یہ شکایت کی کہ تمہاری اس کوشش نے فرعون کو اور زیادہ مخالف بنا دیا ہے۔ نیز جو کچھ ہمیں سہولتیں حاصل تھیں وہ بھی ختم ہوگئی ہیں۔

(ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ از آیت ۵۵ تا ۵۹ اور مائدہ از ۲۳ تا ۲۸)

یہ ذلت انگیزی پر قناعت اور جدوجہد سے گریز سب انکی بے عملی و بدعملی کے اثرات وثمرات تھے جس کی بناء پر جوہر انسانیت پامال ہوگئے تھے۔ ان کے سینے میں نہ سچا دل باقی رہ گیا تھا اور نہ دل میں زندگی پیدا کرنے والی آرزوئیں رہ گئی تھیں۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا ابتدا میں ردعمل ہوا۔ اسی طرح ہر زوال پذیر قوم میں انقلابی تحریکوں کو جو ردعمل ہوتا ہے وہ سب مذکورہ بالا حقائق کی شہادت میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

(۴) قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے عیش پرستی کی ذہنیت ہر خاص وعام پر مسلط ہو جاتی ہے مفت خوروں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو قوم پر بار بنتا ہے اور حرکت وعمل کے بغیر عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کا خواہشمند رہتا ہے۔

ایسی حالت میں ہمدردی، غم خواری، ایثار وقربانی وغیرہ کے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں۔ اور خودغرضی، خودفریبی، خوش فہمی وغیرہ کے جذبات ابھر آتے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے خوفزدہ رہتا ہے۔

تاریخ کا یہ المیہ بھی عجیب وغریب ہے کہ طبقاتی کشمکش کے وقت امراء اور قومی

نمائندوں کا ہمیشہ اتحاد رہا ہے اور انسانیت کی تذلیل میں دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا ہے

چنانچہ قرآن حکیم نے سرمایہ داری کا کردار قانون کے ذیل میں یہ بیان کیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جب یہ انفرادی زندگی میں ابھرتی ہے تو کس قدر درندگی اور خدا فراموشی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اسی طرح قومی نمائندوں کا ذکر درج ذیل قسم کی آیات میں ہے جس سے ان کی حق کے معاملہ میں سرکشی اور ناحق مال خوری کا اندازہ ہوتا ہے۔

اے مومنو! یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء و مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں۔ (سورۃ التوبہ آیت ۲۲)

نزول قرآن کے وقت یہود و عیسائی چونکہ زوال پذیر قوم تھے اس لئے ترجمہ میں انہی کے علماء و مشائخ مراد لئے گئے ہیں۔ یہی حالت زوال کے وقت ہر قوم کے اکثر علماء و مشائخ کی ہوتی ہے۔

(۵) توکل اور تقدیر کا غلط مفہوم عام ہو جاتا ہے جس کی بناء پر قوائے عملی مفلوج ہو جاتے ہیں۔ ناعاقبت اندیشی و غیر مستعدی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اور بلا جدوجہد یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ تقدیر میں تھا وہ ہوا اور آئندہ بھی وہی ہوگا جو تقدیر میں ہوگا۔ گویا تقدیر کی حیثیت ان کیلئے آہنی زرہ کی ہے جو انہیں پہنا دی گئی ہے وہ دن بدن بھنچتے جاتے ہیں اور زرہ قبضہ کرتی جاتی ہے۔

اس صورتحال کا اثر زندگی میں یہ نمایاں ہوتا ہے کہ اپنی ذات اور مزعومہ مذہب کے علاوہ دوسری تمام چیزوں سے کنارہ کشی میں انہیں عافیت معلوم ہوتی ہے۔ نیز قدامت پرستی و تقلیدی جمود ان میں سرایت کر جاتا ہے جیسا کہ اس کی تائید قوموں کے درج ذیل جوابات سے ہوتی ہے۔

"ہمیں وہی کافی ہے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا"۔ (سورۃ المائدہ آیت ۱۱۴)

"ہم نے باپ دادا کو اسی عقیدہ اور طریقے پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر چلیں گے"۔

(سورۃ الزخرف آیت ۲۳)

نیز زندگی کی کشمکش سے گریز کرتے کرتے مذہب چند مراسم ورواج کا مجموعہ رہ جاتا ہے، اس کے باوجود خوش فہمی وخود فریبی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اللہ کا محبوب اور جنت کا تنہا مستحق وہ اپنے ہی کو سمجھتے ہیں۔اور بلا جہد وعمل اپنی تعریف کے خواہش مند رہتے ہیں۔

یہودیوں کے بارے میں قرآن حکیم نے ان کے یہ مقولے نقل کئے ہیں۔

''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں''۔(سورۃ المائدہ آیت ۲۲)

''دوزخ کی آگ اگر ہمیں چھوئی بھی تو چند دن کیلئے''۔(سورۃ البقرہ آیت ۷۵)

جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں کیلئے سراہے جائیں جو انہوں نے نہیں کئے ہیں۔اے پیغمبر آپ انہیں عذاب سے چھٹکارا پانے والا نہ سمجھئے۔

(سورۃ آل عمران آیت ۱۸۵)

تقدیر اللہ کے علم اور اندازہ کا نام ہے کہ کوئی شے اس کے علم اور اندازہ سے باہر نہیں ہے اسی طرح توکل، کامل جدوجہد کے ساتھ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کو کہتے ہیں۔

ان دونوں کی صحیح حقیقت نہ تو انسان کو بے عمل بناتی ہے اور نہ ہی سستی وکاہلی پیدا کرتی ہے۔ بلکہ ایک خاص قسم کا زاویہ نگاہ دے کر انسان کو میدان کارزار میں سرگرم عمل رکھتی ہے۔نیز زندگی کے بہت سے فتنے ان دونوں کے ذریعہ دفع ہوتے رہتے ہیں مثلاً کامیابی وکامرانی کی صورت میں غرور نہیں پیدا ہوتا ہے جو ترقی کیلئے بڑی رکاوٹ ہے اور ناکامی کی صورت میں مایوسی نہیں ہوتی ہے جو انسان کیلئے پیام موت ہے۔اسی طرح نفس پر اعتماد کرنے سے جتنے مفاسد پیدا ہوتے ہیں ان سب کا مکمل انسداد ہو جاتا ہے اور بزدلی وکم ہمتی وغیرہ جیسے جراثیم سے حفاظت رہتی ہے جن بعض اجتماعیین (سماجی ماہرین) نے ان دونوں پر اعتراض کیا ہے وہ ان کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ان لوگوں نے غلط مفہوم کو مروج دیکھ کر اصل سمجھ لیا ہے اور اسی پر اعتراض کی عمارت قائم کر دی ہے۔

(۶) دل سخت اور بے جان ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے عبرت پذیری اور تنبہ کی استعداد معدوم ہو جاتی ہے اور انسان اپنی تباہ شدہ حالت پر قانع اور مطمئن بن جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ترقی کی امنگوں اور جاندار تمناؤں وغیرہ کا سوال ہی نہیں باقی رہتا ہے۔

(بدعملیوں اور شقاوتوں کی وجہ سے) تمہارے دل سخت ہو گئے اور ایسے سخت گویا پتھر کی چٹانیں یا ان سے بھی زیادہ سخت (سورۃ البقرہ آیت ۷۰)

قرآن حکیم کی روشنی میں قساوت قلبی کے اثرات درج ذیل ہیں۔

۱۔ حق وصداقت کی وضاحت کے بعد بھی لوگ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ (سورۃ البقرہ آیت ۸۷)

۲۔ مصلحین پر طرح طرح کے اتہام لگا کر انہیں ناکام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (۶۱/۵، ۳۳/۲۸)

۳۔ ایک دوسرے کے مذہب کی تکذیب وتنقیص کرتے ہیں جو اختلاف ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر ہوتا ہے اسکو وہ عین دین سمجھتے ہیں۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۱۰)

۴۔ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں مقابل کی طاقت دل ودماغ پر مستولی (غالب) ہو جاتی ہے کہ اس کے تصور ہی سے لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ (سورۃ المائدہ آیت ۲۶)

۵۔ قلت وکثرت کی بحث چھڑ جاتی ہے حالانکہ کامیابی وناکامی کا مدار قلت وکثرت پر نہیں ہے بلکہ ذاتی جوہر وصلاحیت پر ہے۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۵۱)

۶۔ دن بدن برائی سے روکنے والے کم ہوتے جاتے ہیں اور دین فروشوں کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ (سورہ الاعراف آیت ۱۶۹)

(۷) مال ودولت اور زندگی سے محبت بڑھ جاتی ہے۔ جس کے حسب ذیل اثرات زندگی میں نمودار ہوتے ہیں۔

۱۔ عزم وہمت اور ایثار وقربانی کے کام نہیں ہو پاتے ہیں۔

۲۔ قومی و جماعتی مفاد نظروں سے اوجھل ہو کر صرف ذاتی اغراض و مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔

۳۔ فوجی طاقت چھن جاتی ہے اور سامان حرب کی جگہ سامان تعیش لے لیتے ہیں۔

۴۔ خوشامد و چاپلوسی کے جذبات خبیثہ زندگی میں سرایت کر جاتے ہیں۔

۵۔ حقوق کے تحفظ قیام و بقاء کی جدوجہد، قومی عزت و ناموس کے جذبات دل سے نکل جاتے ہیں۔

چند آیتیں یہ ہیں۔

''زندگی کی سب سے زیادہ حرص رکھنے والے یہی لوگ ہیں، مشرکوں سے بھی زیادہ ان میں سے ہر آدمی کا دل یہ حسرت چاہتا ہے کہ کاش ایک ہزار برس تک تو جیئے''۔ (سورۃ البقرہ آیت ۹۱)

''ان میں ایک گروپ ایسا ہے کہ اگر ایک دینار کیلئے بھی ان پر بھروسہ کرو تو کبھی تمہیں واپس نہ دیں جب تک کہ ہمیشہ ان کے سر پر کھڑے نہ رہو''۔ (سورۃ آل عمران آیت ۶۹)

''ان میں سے بہتوں کو آپ دیکھیں گے کہ گناہ و ظلم کے ارتکاب اور مال حرام کھانے میں بہت تیز ہیں، کسقدر برے کام ہیں جو یہ شب و روز کر رہے ہیں''۔ (سورۃ المائدہ آیت ۶۸)

مذکورہ بعض اثرات کا ثبوت اس حدیث سے بھی ہوتا ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے آدمی کھانے کی رکابی پر ٹوٹ پڑتے ہیں''

صحابہؓ نے سوال کیا کہ اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟ فرمایا نہیں بلکہ بہت ہوگی۔ لیکن تمہاری حالت ایسی ہو جائے گی جیسے پانی کی سطح پر گھاس پھوس ہوتا ہے ''غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيل'' تمہاری ہیبت دشمنوں کے دل سے نکل جائے گی اور تم کسی شمار و قطار میں نہ رہ جاؤ گے۔

صحابہؓ نے پھر سوال کیا یہ حالت کیونکر ہو جائے گی؟ فرمایا! تمہارے اندر ''وھن'' پیدا ہو جائے گا ''وھن'' کا مطلب دنیا (مال و دولت وغیرہ) سے محبت اور موت سے کراہت ہے۔

(مشکوۃ ج ۲ ص ۱۶۴)

(۸) مال و دولت اور زندگی سے محبت کی وبا عوام ہی تک محدود نہیں رہتی ہے بلکہ اکثر علماء بھی اس میں ملوث ہوتے ہیں۔ اور وہ اس سلسلے میں احکام الٰہیہ کی تحریف سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں۔ نیز آسان اور اپنی ضرورت کے مطابق احکام قبول کر لیتے ہیں اور جن میں محنت و مشقت پڑتی ہے انہیں چھوڑ دینے میں عافیت سمجھتے ہیں۔

علماء کے بارے قرآن حکیم کی تصریحات یہ ہیں

(۱) وہ کلموں کو اپنی مناسب جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ (سورۃ المائدہ آیت ۴۶)

(۲) پھٹکار ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں۔ (سورۃ البقرہ آیت ۷۴)

(۳) جنہیں اللہ کی کتاب دی گئی ہے ان میں سے ہر ایک فریق نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ (سورۃ البقرہ آیت ۹۱)

(۴) کیا ایسا نہیں ہوا کہ جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ حکم لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے موافق نہ ہوا تم نے غرور کیا۔ (سورۃ البقرہ آیت ۸۲)

عصری تقاضوں سے غفلت کے مظاہر

بے عملی اور بد عملی کی دوسری صورت کہ حالات و زمانہ کے تقاضا کی مناسبت سے جس قسم کی جدوجہد درکار ہے اس سے غفلت برتی جائے۔ اس کے اثرات حسب ذیل طریقہ پر زندگی میں نمایاں ہوتے ہیں۔

(۱) ذہنیتوں پر پردے پڑ جاتے ہیں کھلی ہوئی ترقی کی راہوں کو دیکھنے کے باوجود انہیں اپنانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ شیطان ان کے اعمال کو ان کی نظروں کے سامنے اس طرح خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے جو کچھ ان کے پاس چند پرانی راہ و رسم کا مجموعہ رہتا ہے۔ بس اسی میں وہ مگن رہتے ہیں۔

قرآن حکیم نے مختلف قوموں کے تذکرہ میں رسولوں کی تکذیب و تنقیص اور ان کی

اصلاحی وانقلابی تحریک کی مخالفت کا جو ذکر کیا ہے وہ دراصل انہی اثرات کا نتیجہ تھا جیسا کہ ان کے تفصیلی حالات وواقعات سے ظاہر ہے۔

(۲) لوگ علم وحکمت کی تحصیل سے گریز کرتے ہیں کیونکہ جس دنیا میں وہ رہتے ہیں وہاں علم وحکمت کا گذر ہی نہیں ہوتا ہے۔ ان کا قلب ہی نہیں بیکار ہوتا بلکہ ذہن وادراک کی ساری قوتیں بھی بیکار ہوجاتی ہیں۔ اور وہ جانوروں سے بھی بدترین بن جاتے ہیں۔

(سورۃ الانعام آیت ۱۷۹)

(۳) مذہب کے غلط تخیل کی وجہ سے دین اور دنیا کی تقسیم ہوجاتی ہے۔ دیندار اور دنیادار دو الگ الگ طبقے بن جاتے ہیں اور یہ خیال عام ہوجاتا ہے کہ دنیا کے ساتھ دین پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ (حالانکہ دین ہمیشہ کیلئے آیا ہے آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ اسی دنیا کے اثرات ونتائج ہوں گے)

اس تقسیم کے بعد مذہبی طبقہ کی اکثریت کے سامنے کوئی میدان نہ رہ جانے کی وجہ سے وہ آپس میں دست وگریباں رہتی ہے اور اس کے جدوجہد کی ساری دوڑ چند فروعی اور فرسودہ مسائل (جن کا زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں رہتا) کی موشگافیوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔

چنانچہ مسلمان اپنے دور اول میں جب عدل ورحمت کا نظام قائم کرنے کیلئے بعض عیسائی ممالک میں گئے تو وہاں کے پادریوں کو ان مباحث میں مصروف پایا کہ عیسی علیہ السلام کا پیشاب پاک تھا یا ناپاک، اور آسمان سے جو دسترخوان (مائدہ) آیا تھا اس میں خمیری روٹی تھی یا فطیری (غیر خمیری)

آج مسلمانوں میں بھی اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جو بہت سے علمائے کرام کا ذریعہ معاش بنے ہوئے ہیں اور دنیادار طبقہ کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتی۔ اس بناء پر وہ اور زیادہ مفاد پرستی وہوس رانی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کیلئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ''جراثیم تمدن'' جو ترقی کا نقاب ڈالے ہوئے ہوتے ہیں وہ انہیں کو ترقی کیلئے سب کچھ جان کر اختیار کرلیتا ہے اور خود فریبی میں مبتلا ہوکر یہ سمجھتا ہے کہ ہم زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے رہے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جن بعض ماہرین اجتماعیت نے ترقی کی راہ میں مذہب کو رکاوٹ قرار دے کر کہا ہے کہ ''مشرقی اقوام کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہب ہے''

(تمدن ہند از ڈاکٹر لیبان ص ۱۸۲)

وہ دراصل اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت اور اسلامی تاریخ سے تعصب کی بنا پر ہے چنانچہ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مسلمان اپنے ابتدائی دور میں جس قدر مذہب کی پابندی میں سخت تھے اسی قدر فتوحات اور ترقیات کا سلسلہ وسیع تھا۔ بعد میں جس قدر مذہب سے اعراض بڑھتا گیا شرک ونفاق اپنا قدم جماتے گئے اور بے عملی وبدعملی کے ''جراثیم'' پیوست ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیام وبقا کی جدوجہد میں وہ پیچھے رہ گئے اور دوسری قومیں ان سے آگے نکل گئیں۔

جن لوگوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ سائنٹفک دور کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے نہیں بلکہ نزول قرآن کی تاریخ (چھٹی صدی عیسوی) سے ہوا ہے اسی نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کی ساری چیزیں (آفتاب وماہتاب سے لے کر ذرہ تک) اپنی اصلی ساخت اور مقصد کے لحاظ سے انسان کی خدمت گذاری کیلئے پیدا ہوئی ہیں اور انسان کو یہ اہلیت دی گئی ہے کہ وہ عقل وتجربہ کی رہنمائی سے ان پر قابو حاصل کر کے اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ دنیا کے دیگر مذاہب سائنس کے عناصر کو مافوق القوۃ اور مقدس اشیاء سمجھ کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ یا اس خیال کے ماتحت کہ ''اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے حکمرانی کیلئے شیطان کے حوالے کر دیا ہے'' مطالعہ فطرت کو مذموم جانتے تھے اور جو کوئی اس کی جانب توجہ کرتا اس کا بھوت پلید سے تعلق جوڑتے تھے۔

چند علماء یورپ کی شہادتیں

قرآن کریم کے اسی تخیل کے پیش نظر جیسی جیسی خواہشیں اور ضرورتیں بڑھتی گئیں

مسلمان برابر ادھر توجہ کرتے رہے حتی کہ یورپ کو اس قابل بنایا کہ وہ نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھ سکے۔

جیسا کہ جان ڈیون پورٹ نے لکھا ہے:

''تمام علوم مثلاً طبعیات، نجوم، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ جو چودھویں صدی عیسوی سے یورپ میں رائج ہوئے، وہ سب کے سب عربی مدارس سے ماخوذ ہیں۔ اس بناپر ہسپانیہ کو یورپی فلسفہ کا موجد تسلیم کرنا چاہیئے''۔

عربی مدارس میں یہ ساری تعلیم بلا امتیاز مذہب وملت دی جاتی تھی کسی قوم و مذہب تخصیص وتفریق نہ تھی۔ ''رینان'' کہتے ہیں۔

''سائنس اور ادب کا مذاق دسویں صدی عیسوی تک دنیا کے اس ممتاز گوشہ میں اس طرح قائم ہوگیا تھا جس کی رواداری کی مثال موجودہ دور میں عنقاء ہے۔ عیسائی، یہود، مسلمان سب ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ایک ہی نغمہ گاتے تھے اور ایک ہی ادبی وسائنٹفک مسند درس کے حاشیہ نشین تھے، وہ تمام قیود جن کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے جدا رہتے تھے وہ یکلخت اٹھا دیئے گئے تھے، اور سب کے سب متفق ہوکر مشترکہ تمدن کی بنیاد ڈالتے ہیں وہ مصروف جدوجہد ہوگئے تھے۔ قرطبہ کی مسجدیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ رہتے تھے وہ اس علم وحکمت کا مرکز بن گئی تھیں''۔

''گستورکس'' نے ''اسلام کا احسان یورپ پر'' نامی کتاب لکھی ہے جس میں صراحۃً کہا ہے کہ

''یورپ سائنٹفک انکشافات میں اسلام کا ممنون ہے۔ اسلام ہی کے طفیل علماء سائنس بیکن، نیوٹن وغیرہ جیسے لوگ پیدا ہوئے اگر مسلمانوں نے کاغذ، بارود، قطب نماء اور دیگر آلات ترقی کو رواج نہ دیا ہوتا تو یورپ کی سائنس اور تہذیب کی چودہ سو برس پہلے جو حالت تھی وہی آج ہوتی''

ان تصریحات کے بعد اسلامی تعلیمات پر کیسے، کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟

بے عملی و بدعملی تاریخ کے آئینہ میں

ذیل میں ہم بے عملی و بدعملی کے اثرات چند تاریخی شہادتوں کی روشنی میں بیان کرتے ہیں جن سے مذکورہ بالا بیان کی مزید توثیق ہو سکے گی۔

رومن قوم کا حال اس کے زوال کے زمانہ میں ''لیسکی'' نے یہ بیان کیا ہے:

''رومی قوم اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہروں میں جن میں کثیر التعداد زاہد اور راہب پیدا ہوئے تھے وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی، غرض بدکاری اور توہم پرستی کا اجتماع ہو گیا تھا۔ جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔

رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو رسوائی اور بدنامی کا مطلق خوف باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری اور دغابازی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی'' (تاریخ اخلاق یورپ ص ۱۴)

ڈاکٹر گبن نے رومی قوم کی حالت پر نہایت تفصیلی بحث کی ہے وہ کہتے ہیں:

''عیش پرستی کا یہ حال تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل (ازدواجی زندگی) کی بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے۔ تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔۔۔۔۔۔ کفایت شعاری جتنی زیادہ ہوتی جاتی تھی اسی نسبت سے اس کی طرف سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اس زمانہ کے لوگ تن آسانیوں میں رہ کر زوال کے اسباب نہ دیکھتے، رومی زندگی میں ایک زہریلا اثر سرایت کر رہا تھا۔ شعراء اور مقررین کی لوگ غلامانہ تقلید کرتے تھے جدت طبع ختم ہو چکی تھی اور یہ ایسا تنزل تھا جس سے ان کے جذبات پست و ذلیل اور قویٰ پژمردہ ہو گئے تھے'' (تاریخ روما ج ۱، ۲)

سیل صاحب نے دیباچہ قرآن میں لکھا ہے کہ:

''گرجا کے پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت، نیکی کو مفقود کر دیا تھا۔ اصل مذہب بھول گئے تھے اور اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے۔ اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کیلئے باعث ننگ ہیں مذہبی صورت میں قائم کئے گئے۔ خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی تھی۔۔۔۔ بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد و اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت متبدل ہوگئی ان کا مقصد روپیہ پیدا کرنا، خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے'' (سیرت النبی ج ۳ ص ۲۲۶)

ایرانیوں کا حال بھی بحیثیت مجموعی رومیوں جیسا تھا چنانچہ:

''بادشاہوں کے ظلم و ستم کا بازار گرم تھا، امراء کی عیش پرستیوں اور خود غرضیوں نے صداقت و اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر (جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے) فنا کر دیئے تھے۔ لوگوں میں خست و دنائت سرایت کر گئی تھی۔ اور اعمال صالحہ و اخلاق فاضلہ سے اعراض کرنے لگے تھے تعیش پرستی و آزادروی کا نتیجہ تھا کہ چھٹی صدی عیسوی میں قباد اول بن فیروز کے زمانہ میں ''مزدک'' نامی تحریک وجود میں آئی (مزدک مجوسیوں کا ایک روحانی پیشوا تھا) جس نے دولت اور عورت کو مشترک قرار دیا۔ ہوس رانی امراء اور عوام دونوں نے اس تحریک کو خوشی خوشی قبول کیا اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ وہ تقریباً ساری قوم عیش پرستی کے نشہ میں مخمور ہوگئی'' (تاریخ ایران)

۵۳۱ء میں خسرو نوشیروان نے اس فتنہ کو بزور شمشیر دبانے کی کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ (الملل والنحل ج ۱ ص ۲۶)

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے رومیوں اور عجمیوں کے اسباب زوال پر نہایت قیمتی بحث کی ہے۔ اس کا مطالعہ اس موقع پر نہایت مفید ہے۔

مسلم حکومت کے اسباب زوال پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے۔

اوراس زمانہ میں ملک کی خرابی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں۔

(۱) سرکاری خزانہ پر تنگی اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعویٰ کے ساتھ حاصل کرتے ہیں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں کہ جن کا حق اس خزانہ میں ہے یا ان لوگوں میں سے ہیں جنکو بادشاہ خود انعام دیا کرتے ہیں جیسے زہد پیشہ صوفی شاعر اور دوسرے وہ لوگ جو ملک وقوم کا کوئی کام کئے اور محنت کئے بغیر کسی نہ کسی طرح روزی حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں اور ملک وقوم پر بوجھ ہیں۔

(۲) دوسرا سبب کاشت کاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر تحصیل وصول میں یہاں تک سختی کرنا کہ جو ہمارے مطیع اور حکم کے ماننے والے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش و نادہندہ ہیں وہ باغی بن رہے ہیں۔ حالانکہ ملک وسلطنت کی آبادی وسرسبزی کم محصول فوج اور عہدہ داروں وغیرہ کے بقدر ضرورت تقرر پر ہے اس زمانہ کے لوگوں کو ہشیاری کے ساتھ سیاست کے اس نکتہ کو سمجھنا چاہیئے۔ (باب سیاست المدینہ، حجت اللہ البالغہ)

شاہ صاحب نے ان دو سببوں میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ تجربہ کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ قومی زندگی میں یہ دونوں کب اور کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟

شاہ صاحب کا مقصد انہی وجوہ اور اسباب کی طرف نشاندہی کرنا ہے۔ بطور اثر اور نتیجہ کے دو باتیں بیان کر دی ہیں تا کہ غور وفکر کرنے والے ان دونوں کی گہرائی تک پہنچ کر کھوج لگالیں۔

ایک اور موقع پر حضرت شاہ صاحب عیش پرستی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''عام وخاص، رعایا و دہقان، امیر وغریب کوئی نہیں باقی رہ گیا تھا جس پر عیش وآرام نہ مسلط ہو''۔ (ایضا)

دراصل عیش وعشرت ایسی ذہنیت ہوتی ہے جو زوال پذیر قوم کے افراد پر مسلط ہو جاتی ہے خواہ مال و دولت ان کے پاس ہو یا نہ ہو۔

البتہ جب مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو اس ذہنیت کے مظاہرہ کی شکل دوسری ہوتی ہے اور جب فراوانی نہیں ہوتی ہے تو اس کی دوسری شکل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ذہنیت کا مظاہرہ کسی نہ کسی شکل میں بہرصورت ہوتا رہتا ہے۔

(۳) باطل پرستی وخود فریبی

انسان معنوی لحاظ سے دو جز سے مرکب ہے۔ (۱) ایک وہ ہے جس کے ذریعہ حیات حیوانی کے قیام وبقاء کی جدوجہد ہوتی ہے۔ (۲) اور دوسرا وہ جس کے ذریعہ حیات انسانی (انسانیت) کے نشوونما کی جدوجہد ہوتی ہے۔

دوسرے جز کا ماحصل حق اور حقیقت کا ادراک اور عملی زندگی میں اسے بروئے کار لانا ہے۔ قوم جب باطل پرست رہتی ہے تو زیادہ تر اس کا اثر اسی دوسرے جز پر پڑتا ہے جس کی بنا پر:

(۱) بصیرتِ نفس ختم ہو جاتی ہے۔ صحیح ذوق و وجدان نہیں باقی رہتا ہے۔ چنانچہ نہ حق کا صحیح ادراک ہو پاتا ہے اور نہ ہی اس کے بروئے کار لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت میں بھی غور وفکر کرنے والے لوگ موجود رہتے ہیں لیکن ان کا زیادہ تر تعلق یا تو حیات حیوانی سے رہ جاتا ہے اور یا یہ کہ حیات انسانی سے متعلق ان کی کوششیں بارآور نہیں ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم نے قوم کی اسی حالت کو ''ختم اور طبع'' (مہر کرنا) وغیرہ الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی لئے چند لوگوں کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں''۔ (سورۃ النساء آیت ۴۵)

بصیرت نفس، ادراک کی اس استعداد کا نام ہے جو حق پرستی کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتی ہے اور تعقل (عقل پسندی) کے متعارف ذرائع سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اِلقاء، کشف و اِلہام (دل میں بات آنا) وغیرہ اسی ذریعہ ادراک سے متعلق ہیں۔

(۲) نفوس میں ایک خاص قسم کا انجماد پیدا ہو جاتا ہے۔ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود نہ اس کا اثر لیا جاتا ہے اور نہ ہی حالت میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے ان کے پاس دل ہوتے اور سمجھتے بوجھتے کان ہوتے اور ان کے ذریعہ سنتے ہوتے اصل یہ ہے کہ لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں۔ دل اندھے ہیں۔

(سورۃ الانبیاء آیت ۴۶)

سینوں میں ان کے پاس دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں۔ (سورۃ الاعراف آیت ۱۷۹)

اصل یہ ہے کہ حیات اجتماعی کا مایہ خمیر ہی افراد کی تعلیم پذیری واثر پذیری ہے۔ جب تک افراد میں ایسی لچک موجود رہتی ہے کہ مؤثرات خارجی (بیرونی محرکات) کو جذب اور ہضم کر سکتے ہیں اسی وقت تک جماعتی زندگی اور اس کے خدوخال باقی رہتے ہیں، اور جب اندرونی زندگی میں انجماد پیدا ہو جاتا ہے اور خارج کی کوئی شے انہیں متاثر نہیں کر سکتی ہے تو جماعتی نظم ونسق درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر ارتقاء کی ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہیں۔

اس بارے میں پروفیسر ''جیمس'' نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ انسان اصولاً بس ایک تقلید کرنے والا حیوان ہے اس کی ساری تعلیم پذیری بلکہ ساری تمدنی ترقی کا دارومدار انسان کی اسی خصوصیت پر ہے (فلسفہ اجتماع ص ۲۶)

ممکن ہے اس میں کسی قدر مبالغہ ہو لیکن بہت حد تک اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(۳) قوم بحیثیت مجموعی عجائب پرست بن جاتی ہے جہاں ذرا سی کوئی بات عجیب معلوم ہوئی بس اسی کی معتقد بن گئی اور اسی کے پیچھے چل پڑی۔

ایسی حالت میں نہ سچے رہنماؤں کی قدر باقی رہتی ہے اور نہ ہی حقیقی اعمال وافعال کی، بلکہ اس کا کام ہر شعبدہ باز سامری صفت کے ہاتھوں کھیلنا اور خود فریبی میں مبتلا ہو کر ہر حق پرست کو مطعون کرنا رہ جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہودی قوم کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

''سامری ان کے لئے ایک بچھڑا نکال کر لایا محض ایک بے جان دھڑ جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی لوگ یہ دیکھ کر بول اٹھے یہ ہے ہمارا معبود اور موسیٰ کا معبود، مگر وہ بھول میں پڑ گیا''۔ (سورۃ طٰہٰ آیت ۸۸)

(۴) علم وہنر ایجادات وانکشافات کے باوجود سوسائٹی کے جرائم سمجھنے والے لوگ نہیں رہ جاتے ہیں اور جو رہتے بھی ہیں ان کی آواز کالعدم بن جاتی ہے اس طرح رفتہ رفتہ قوم کی سیرت بالکلیہ مسخ ہو جاتی ہے اور وہ جرائم پیشہ بن جاتی ہے۔

(ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم لوگوں کے چہرے مسخ کر کے ان کے پیٹھ کے پیچھے کر دیں یا ایسا ہو کہ جس طرح اصحاب سبت پر ہماری پھٹکار پڑی تھی اس طرح ان پر بھی پڑے، یاد رکھو اللہ نے جو کچھ فیصلہ کر دیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ (سورۃ النساء آیت ۵۱)

(۵) ایسی حالت میں بھی ان کی عقل مندی وہوشیاری کا اعتراف قرآن حکیم کی اس آیت میں ہے۔

''اور ہم نے قوم عاد وثمود کو ہلاک کیا جن کے مکانات کے آثار تمہارے سامنے ہیں۔ شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر دکھایا تھا حالانکہ وہ لوگ ہوشیار وعقل مند تھے۔ (سورۃ العنکبوت آیت ۳۸)

خود فریبی میں مبتلا ہونے کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ مروجہ بدعات اور جراثیم تمدن کو شیطان ان کی نظروں میں بقاو ارتقا کا سبب بنا کر پیش کرتا ہے۔ جس کی بناء پر ان چیزوں سے نہ بچنے کی نوبت آتی ہے۔ اور نہ ضرورت ہی پیش آتی ہے۔

(۴) عدم استقامت وخودغرضی

زوال کا چوتھا اہم سبب عدم استقامت وخودغرضی ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے زندگی میں جب صبر کے جذبات کمزور پڑتے ہیں تو مذکورہ قسم کے جذبات ابھر آتے ہیں جن سے ایک طرف تو وہ اخلاق تباہ ہوتے ہیں جو بقا کیلئے ضروری ہیں مثلاً عدل، ہمدردی، فیاضی، ایثار وقربانی وغیرہ۔

اور دوسری طرف ان اوصاف پر زد پڑتی ہے جو ارتقاء کیلئے لازمی ہیں مثلاً ہمت، قوت ارادی، عملی قابلیت، اقدام عمل، شوق تحقیقات، قوت استنباط، جدت طبع وغیرہ۔

قوم جب گراوٹ کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو خواہش کا نام ارادہ پڑ جاتا ہے انسانی ضمیر سپر ڈالتا ہے اور موروثی اخلاق واوصاف تک محفوظ نہیں رہ پاتے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں چند اثرات یہ ہیں۔

(۱) قوم کے افراد عزم ومقاصد کی راہ میں مصائب ومشکلات جھیلنے کے بجائے شکوہ سنجی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب ہمت وجوانمردی کے جوہر دکھلانے کا وقت آتا ہے تو کوسنا اور قسمت کا ماتم کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس راہ کی معمولی سی معمولی تکلیف بھی ان کیلئے پہاڑ بن جاتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہودیوں کو صبر وثبات کی تعلیم دی تو انہوں نے یہ جواب دیا:

تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور آنے کے بعد بھی ہم ستائے جا رہے ہیں۔

(سورۃ الاعراف آیت ۱۲۸)

(۲) ذہنی طوائف الملوکی کی وبا عام ہو جاتی ہے تو قوموں میں انتشار اور رایوں پر اغراض کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

''تو ان کو متفق سمجھتا ہے حالانکہ ان کے دل متفرق ہیں'' (سورۃ الحشر آیت ۱۴)

(۳) مرغوبات ومفادات میں الجھ کر ہجرت، جہاد اور نصرت (جو قیام وبقاء کیلئے ضروری ہیں) سے روگردانی کی جاتی ہے اور طرح طرح کا ربر آری (حیلہ جوئی) کی کوشش ہوتی ہے۔

''وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم قتال مناسب جانتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہوتے''۔

(سورۃ آل عمران آیت ۱۶۱)

حالانکہ ان کی اندرونی کیفیت یہ ہوتی ہے۔

''وہ لوگ ایمان کے مقابلہ میں کفر سے زیادہ نزدیک تھے، زبان سے ایسی بات کہتے ہیں، جو حقیقتاً ان کے دل میں نہیں ہے''۔ (سورۃ آل عمران آیت ۱۶۱)

(۴) ضبط نفس باقی نہیں رہتا ہے، نظم واطاعت اور استقامت کی روح ختم ہو جاتی ہے، کام کے ولولے نہیں پیدا ہوتے ہیں اور اگر کچھ کام شروع بھی کیا تو ثابت قدمی سے محروم رہتے ہیں۔

چنانچہ نہر کے پانی کے سلسلہ میں جب یہودیوں کی آزمائش کی گئی تو انہوں نے انتہائی بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے پانی پی لیا'' (سورۃ البقرہ آیت ۲۵)

جب قوم کے افراد ایک گھڑی کی پیاس بھی ضبط نہ کر سکیں تو زندگی کی کشمکش سے عبور کرنے کی کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے۔

ایسی حالت میں قوم کے جوانوں اور نوجوانوں کے دلوں میں بھی یاس وحرمان کی تخم پاشی ہو جاتی ہے۔ ان کی قوتِ ارادی مفقود ہو جاتی ہے۔ اور وقتی و ذاتی فائدے کے غلام بن جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اصلی سرمایہ قوم کے جوان اور نوجوان ہی ہوتے ہیں یہی زندگی بخش تصورات قبول کرتے ہیں اور انہی کے ہاتھوں انقلاب آتا ہے۔ بوڑھوں میں چونکہ قوت مدافعت اور قوت اقدام کی کمی ہوتی ہے۔ نیز شعوری وغیر شعوری طور پر ان پر ماحول کا کافی اثر ہوتا ہے۔ اس لئے انقلابی تصور ان کے دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو اسکو بروئے

کارلانے کی ہمت وسکت نہیں باقی رہتی ہے۔

قرآن حکیم سے بھی ایک جزئی واقعہ میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔

''موسیٰ پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک گروہ جو قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا''

(سورۃ یونس آیت ۸۲)

جب کسی قوم کا یہ طبقہ ذہنی وفکری اور عملی لحاظ سے تباہ ہوجائے تو پھر اس قوم کے ابھرنے کی امیدیں ختم ہوجاتی ہیں اور دن بدن ذلت وپستی کے غار میں گرتی چلی جاتی ہیں۔

جوانی اور بڑھاپے کی ایک نئی تقسیم

یہاں ایک یہ شبہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات عزم وحوصلہ میں جوان، بوڑھے نظر آتے ہیں۔ اور بوڑھے، جوان بن جاتے ہیں اس بناء پر قیام وبقاء کی جدوجہد صرف جوانوں تک محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔

میرے خیال میں قیام وبقاء کی جدوجہد کے سلسلہ میں عمر کو جوانی اور بڑھاپے کے بجائے تین دوروں میں تقسیم کرنا زیادہ مناسب ہے۔

(۱) وہ دور جس میں خود کی زندگی نمایاں مقام رکھتی ہے۔

(۲) وہ جس میں دوسروں کی زندگی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

(۳) وہ جس میں خود دوسروں کیلئے بار بنتا ہے۔

یہ تقسیم سن اور سال پر منحصر نہیں بلکہ اندرونی جذبات اور ذہنیت پر اس کا دارومدار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص عمر کے لحاظ سے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو لیکن ذہنی اور جذباتی زندگی کے لحاظ سے وہ دور اول کے قابل ہو۔اسی طرح ممکن ہے ذہنیت اور جذبات کے لحاظ سے دوسرے اور تیسرے دور کے لائق لیکن عمر کے لحاظ سے ابھی وہ جوان بلکہ نوجوان ہو۔

اس تقسیم کے لحاظ سے انسان صرف پہلے دور میں انقلابی جدوجہد کیلئے موزوں ہوتا

ہے۔اور جوان کہلاتا ہے۔خواہ اس کی عمر کچھ ہو جہاں اس نے دوسرے دور میں قدم رکھا بس وہ الجھ کر رہ جاتا ہے اور ایثار وقربانی کے کام اس سے نہیں ہو پاتے ہیں۔اس بنا پر بڑھاپے میں داخل شمار ہوتا ہے۔

اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے بھی کسی قدر ہوتی ہے۔''اولاد بخل اور بزدلی کا سبب ہیں'' (مشکوۃ ص ۱۱۹)

ماہرین نفسیات کے ایک شبہ کا جواب

مذکورہ توجیہ میں انسان کے خود غرضانہ جذبات زیادہ آسانی کے ساتھ قربان کرنے کو ترجیح دی گئی حالانہ ماہرین نفسیات کے نزدیک سب سے زیادہ قوی وہ جذبات ہیں جن سے انسان کی حیات شخصی وابستہ ہے۔پھر ان جذبات وخواہشات کا نمبر آتا ہے جن پر اس کی اولاد کا وجود اور ان کی زندگی منحصر ہے۔پھر تیسرے نمبر پر وہ احساسات ہیں جن پر انسان کی حیات عمرانی مشروط ہے۔اس بناء پر سب سے زیادہ قوی خود غرضانہ جذبات ہیں اور ان کا قربان کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔لیکن نفسیاتی اور جذباتی زندگی کی یہ تقسیم دراصل انسان کے انفرادی طبعی تقاضہ اور ڈارون کے فلسفہ ارتقاء کی بنیاد پر ہے۔اور مذکورہ تقسیم کی بنیاد انسان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی کی ہے۔یہ واقعہ ہے کہ جب انسان اجتماعی اور تمدنی زندگی میں قدم رکھتا ہے۔تو احساسات وجذبات کی مذکورہ ترتیب میں یکسر تبدیلی ہو جاتی ہے۔اور انسان خود پر دوسروں کو ترجیح دینے لگتا ہے۔حتیٰ کہ دوسرے کی خاطر اپنے کو وقف بھی کر دیتا ہے۔

یا یہ کہیں کہ ماہرین نفسیات کی تقسیم حیوانی تقاضا پورا کرنے کے سلسلہ میں ہے اس مرحلہ میں انسان ذاتی خواہشات وجذبات ہی کو غالب رکھتا ہے مثلاً بھوک کی حالت میں کبھی اولاد تک کو مار کر کھا جاتا ہے یا فروخت کر دیتا ہے وغیرہ اور مذکورہ بالا تقسیم انسانی تقاضے کے سلسلہ کی ہے جس قدر انسانی تقاضوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اسی قدر دوسروں کی ترجیح کا سوال سامنے آتا ہے اور انسانیت کو نشوونما حاصل ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی دستیاب مطبوعات

دین کے معاشی نظام میں محنت کی قدر و قیمت	مفتی عبدالخالق آزاد
اجتماعی مسائل کا ولی اللہی حل	جناب مقبول عالم (بی اے)
دین کے شعوری تقاضے	مولانا شوکت اللہ انصاری
جدوجہد اور نوجوان	شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ
اسلام کا اقتصادی نظام ایک تقابلی جائزہ	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ولی اللہی تحریک	مولانا سید محمد میاںؒ
امام شاہ عبدالعزیزؒ افکار اور خدمات	مولانا سید محمد میاںؒ
نظام کیا ہے؟	مفتی عبدالخالق آزاد
فرد اور اجتماعیت	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
عبادت و خلافت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
حضرت مولانا محمد الیاس کا تصور دین	مفتی سعید الرحمٰن
غلبہ دین اور عبادات	چوہدری افضل حق مرحوم
ثناء خداوندی	چوہدری افضل حق مرحوم
جدوجہد آزادی کا راہنما ادارہ	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
دینی تمدن کی تشکیل نو	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
استعماری مظالم اور ملی تقاضے	شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ
شریعت، طریقت اور سیاست	مولانا محمد الیاس دہلویؒ مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
قرآنی دعوت انقلاب	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
دین اور حکومت	مولانا سید سلیمان ندوی
تبدیلی نظام کا ولی اللہی نظریہ	مفتی عبدالخالق آزاد

آزادی	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہا
ولی اللہی نظام فکر کی عصری اہمیت	مولانا بشیر احمد لدھیانو
دین وحدت	مولانا سید سلیمان ندوی
ولی اللہی جماعت کا انقلابی کردار اور ہماری ذمہ داریاں	مفتی عبدالخالق آزاد
آزاد قومی پالیسی کا خاکہ	مولانا سید محمد میاںؒ
عزیمت (۱) تا (۷)	(ادارہ)
سیرت نبوی ﷺ کی ضرورت و اہمیت	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہا
مولانا سندھیؒ کا ایک اہم مکتوب	(ادارہ)
جہاد کیا ہے؟	مولانا سید سلیمان ندوی
شاہ عبدالعزیز رائے پوری اور ان کے جانشین	مفتی عبدالخالق آزاد
خانقاہ رائے پور	مفتی عبدالخالق آزاد
سماجی تبدیلی کی حکمت عملی	مفتی سعید الرحمٰن
غلبہ دین اور اس کے اجتماعی تقاضے	مولانا مختار حسن
تقویٰ کیا ہے؟	مولانا عبیداللہ سندھیؒ
دین حق اور برصغیر کا سامراجی نظام تعلیم	مولانا سید حسین احمد
ترقی کا مادی تصور	مفتی سعید الرحمٰن
عدم تشدد کی حکمت عملی (اسوہ حسنہ کا ایک مطالعہ)	مفتی سعید الرحمٰن
اسلام اور گروہیت	مولانا قاری محمد طیب ق
تبدیلی نظام کیوں اور کیسے	مفتی عبدالخالق آزاد
ولی اللہی فکر کا تاریخی تسلسل	مولانا عبیداللہ سندھی

پوسٹ بکس نمبر 938 پوسٹ آفس گلگشت ملتان